لیا جاتا ہے۔ بکاؤ مال بندوق ہو یا برگر، عورت کا ماڈل عام طور پر استعمال میں آتا ہے۔ جس قدر ماڈل جنسی کشش کی مالک ہو گی، اسی قدر اشتہار سریع الاثر بھی ہو گا.....

مارڈن، ترقی یافتہ معاشرے میں عورت چھپانے، سر دھڑ کی بازی لگانے، حیران کرنے کے کام کی نہیں آتی۔ وہ رجھانے، لبھانے اور ستانے کا سمبل بن گئی ہے.....

مرد اب اس کی نو یافت حیثیت کو سمجھنے کی کوشش میں سرگرداں ہے، لیکن خود عورت کو معلوم نہیں کہ وہ برف کی چٹان پر کھڑی ہے یا گرم پانی کے نیچے ڈبکیاں لگا رہی ہے۔ ترقی کی دوڑ میں حاصل آزادی اور ذاتی شناخت کی تلاش اس کی شخصیت کو سیراب بھی کر رہی ہے اور ساتھ ساتھ بنجر بھی کیے جاتی ہے، کیونکہ یہاں پھر عورت کو تضاد کا سفر درپیش ہے۔

ارجمند کے گھر میں میری زندگی اس کے ان ڈور پودوں کی طرح میرے لئے مصنوعی اور جدید ہے، اسی لئے میں سڑک سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور ہوں۔ میرے دماغ درزی میں دردی کی ان گنت رنگ برنگی کترنیں پھلی ہیں۔ میں ان رنگین چھوٹ چھوٹے تقابلی فلسفے سوچنے پر مجبور ہوں۔ گرک بڈھے کے گھر سے چار گھر چھوڑ کر ایک ہندو گھرانہ رہتا ہے۔ ان کے گیراج میں بچوں کا چھوٹا سا پلاسٹکی سوئمنگ پول، سڑکوں پر شور مچانے والے Skates بچوں کی سائیکلیں، پش چیئرز، باربیکیو کی انگیٹھی، ان گنت جوتیاں، کئی وافر ٹرنک، کوڑے کا بڑا ڈرم اور فالتو سامان جمع ہے۔ ہم مشرقی لوگ جوڑنے جمع کرنے کے عادی ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس پرانا سامان، جائیداد، استعمال میں نہ آنے والا پیسہ، پرانے خط، خالی ڈبے، بوتلیں، تصویریں سب کچھ پشت در پشت جڑتا چلا جاتا ہے۔ پھر خاندان میں کوئی شرابی، زانی، تماش بین اس جائیداد یا دولت کا ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ کوڑے کباڑ کو کباڑیا لے جاتا ہے۔ اس طرح صفائی کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور Scvanger بن کر نیچر کی مدد کرتا ہے۔

ہندو خاتون نے ماتھے کی بندی، مانگ کا سیندور، اپنا ساڑھی بلاؤز چھوڑ دیا ہے۔ وہ

اپنے بچوں کے ساتھ اور کبھی کبھی اکیلی نہایت بوسیدہ سی جینز، جوگرز اور بغیر آستینوں کی بلاوز میں گیراج کی صفائیاں کرتی، گروسریز اٹھاتی، چھوٹے بچے کو پش چیئر میں لاتی لے جاتی نظر آتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی تھکن ہے جو حالات سے سمجھوتہ کرنے والے چہروں کا محاصرہ کر لیا کرتی ہے۔ وہ سڑک پر آنے جانے والوں کو وش کرنے میں پہلی کرتی ہے اور گڈ مارننگ یا گڈ ایوننگ کہتے ہوئے نمستے کے انداز میں ہاتھ جوڑ لیتی ہے۔ اس کے چہرے کی تھکاوٹ پر ایک مصنوعی مسکراہٹ کی بدلی چھا جاتی ہے۔ وہ پردیس میں اپنا امیج درست رکھنا چاہتی ہے۔ لاطینی امریکہ، گویٹ مالا اور کیوبا سے آنے والے، چینی، جاپانی، پاکستانی، مشرقی وسطی کے باشندے، بلیک امریکنوں کی طرح بھی وہ زیادہ شائستہ، مددگار، اچھے آداب ظاہر کرنے والی خاتون ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ لوگ اس کی جلد، مذہب اور وطنیت کے فرق کو بھلا کر اسے اکثریت میں ضم کر لیں۔

نہ جانے کیوں میں سیکنڈ کلاس سٹیزن بن کر اتنا تلملاتا ہوں۔ انہی سوچ کے چکروں نے مجھے اندر سے نڈھال کر دیا ہے۔ امریکہ میں آ کر مجھے اقلیت اکثریت کا مسئلہ شدت سے ستاتا ہے۔

اگر کبھی آپ کو سائنس پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور آپ کو چینی کا Salurated Solution بنانے کا موقع ملا ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ محلول ایک حد تک چینی جذب کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ اس کے بعد محلول میں مزید چینی ملائی نہیں جا سکتی۔ اگر اس محلول کو چھوڑ دیا جائے تو یہ سوکھ کر ایک بار پھر دانے دار Crystals کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کوزہ مصری اسی طریق سے بنائی جاتی ہے۔ محلول سوکھ کر ڈنڈی اور دھاگوں سے چمٹ جاتا ہے اور چینی کے محلول کی ایک نئی شکل تشکیل پا جاتی ہے۔

بعینہ وہ ممالک جہاں بہت سی قومیں، مذاہب، رنگ و نسل کی رنگا رنگی موجود ہو،

جب یہی قومیں ایک جگہ بس جائیں تو محلول تیار ہونے لگتا ہے۔ اکثریت کی مثال مچھلی جیسی ہے وہ فطرتاً، وراثتاً، عادتاً، روایتاً اپنے ماحول کے پانیوں سے بے نیاز تیرتی پھرتی ہے۔ اسے کوئی شعوری کوشش نہیں کرنا پڑتی اور وہ ماحول کا حصہ رہتی ہے۔ یوں سمجھئے اکثریت بھرے پانیوں والا دریا ہے۔ اس کا بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ کوئی چیز اس کی رفتار کے آگے ٹھہر نہیں سکتی۔

جمہوریت میں اکثریت من حیث القوم جو کچھ بھی کرتی ہے، اصول ٹھہرتا ہے۔ لباس اتار دے، برہنہپن اصول۔ لباس پہن لے، یہی پہناوا دل پسند ..... ایک شادی رائج کر دے مونوگیمی اصول شادیوں کو رائج کر دے یہی معیار ..... سب کی رائے سے حکومت چلائے درست ..... اکثریت کسی کی نہ سنے اور آمریت کا ہی سونٹا کھڑکائے تو آمریت ہی من چاہا طریقہ۔ اکثریت کے رسم و رواج، کلچر حکومت، سیاست ہی سب کو پسند آئے۔ معیشت کی بانٹ میں منطق ہو یا نہ ہوا اکثریت کا بہاؤ ضرور شامل ہوتا ہے۔ اکثریت اپنے دیس میں لوہا منوا لینے کی حیثیت میں وتی ہے اور دھڑلے کی زندگی بسر کرتی ہے۔ رائے عامہ کا بل ڈوزر سب کچھ ہموار کئے جاتا ہے۔

اکثریت کے مقابلے میں اقلیت کا رول چور کا ہوا کرتا ہے۔ اقلیت نکڑ کے ستون کے پیچھے چھپ کر سڑک کو دیکھتی ہے اور موقع پا کر سڑک پر نکلتی ہے۔ پھر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی محتاط انداز میں سڑک کراس کر جاتی ہے۔ کچھ تارکین اللہ کا فضل تلاش کرنے نئے ملک میں وارد ہوتے ہیں۔ امیروں کو اپنا وطن چھوڑنے کی ضرورت تو نہیں ہوتی، لیکن اپنی دولت چھپانے، ضائع کرنے اور وطن کے جاہلوں پر رعب گانٹھنے کے لئے نئے ملک کی بود و باش اختیار کرنا پڑتی ہے۔ کچھ اپنے وطن کی رسہ گیریوں سے پریشان ہو کر سیاسی پناہ گزین بنتے ہیں۔ اپنے ملک میں عزت نفس کی کمی کے باعث انہیں پردیس کی مشقتوں کو اپنانا پڑتا ہے۔ کچھ اپنے وطن میں اپنے کو محبوس جان کر آزادی کے شوق میں اڑ جاتے ہیں۔ کچھ آزادی کی بے آسرا زندگی کے ہاتھوں بے زار ہو کر نئے

نظاموں میں بندھنا چاہتے ہیں۔ کچھ پر قینچ سکوریٹی کے پنجرے کو قبول کر لیتے ہیں۔ بعض رہائش، آسائش، زیبائش کی خاطر نئے دیس کو اختیار کرتے ہیں۔ کچھ رانجھے کان پھڑوا، کانوں میں مندریاں ڈال پردیس کے جنگلوں میں بسرام کر لیتے ہیں۔ کچھ تبدیلی کو انسانی زندگی کی روح سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو نئے Exposure کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کچھ ہجرت سے ناواقف وطن سے خوفزدہ ہو کر صرف بھیڑ چال کے نرغے میں آ کر امریکہ میں منہ اٹھائے پھرتے ہیں۔ بعض خودرائی کے شوقین روک ٹوک سے گھبرا کر امریکی جنت میں پناہ لیتے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ تعلیم ہی فلاح کا واحد راستہ ہے اور اس کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ وہ یونیورسٹیوں میں برتن مانجھنے، جھاڑو پھیرنے، گھاس کاٹنے کی مشقتوں کو اپنانے میں اپنا ضرر نہیں سمجھتے۔ تعلیم کے پیچھے سرگردان لوگوں کی تعداد امریکہ میں زیادہ ہے۔ انہیں علم کی تلاش کم اور اس سے حاصل ہونے والے تفخر اور ذات کو مور پنکھوں سے سجانے کی ضرورت زیادہ ہے۔ وہ علم کے حصول کے لئے چین کا سفر اختیار کرتے، لیکن ترقی کی دیوی کو زیر دام لانے کے لئے امریکہ ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ امی نبی ﷺ کو مانتے ہوئے تعلیم کو خدا سمجھتے ہیں۔ یہ تضاد کا ایک اور سفر ہے۔

کوئی کس وجہ سے ہجرت اختیار کرتا ہے۔ میں اس کی تفصیل میں جا کر آپ کا وقت ضائع نہیں کرتا۔ اس امریکہ نگری میں بھانت بھانت کے پنچھی اڑ کر آئے ہیں اور دانتوں میں انگلیاں داب دریا کنارے کھڑے اکثریت کے دریا کا بہاؤ دیکھتے ہیں، لیکن اکثریت کے دریا کا بہاؤ کسی کے لئے نہیں بہتا۔ اس کی طغیانی، روانی، سیلانی، سب قدرتی، فطرتی حقیقی ہوا کرتی ہے۔ ہولے ہولے حوصلہ پا کر خوف کا لبادہ اتار کر اپنی پیٹھ ٹھونک ہلاشری دے کر اقلیت اکثریت کے بہاؤ میں غوطہ زن ہو جاتی ہے۔ جو کچھ بھی داؤ پر لگ سکتا ہے لگا دیا جاتا ہے، لیکن یہ بات میں تو بار بار آپ سے کرتا رہا ہوں اور پھر بھی کروں گا۔ ابھی گھنٹی بجی ہے اور گھر پر کوئی نہیں۔ مجھے ہی نیچے جا کر دیکھنا

پڑے گا کہ باہر کون ہے۔

دروازے کے سامنے بڈھا پھونس ایک امریکی جوڑا کھڑا ہے۔ پتہ نہیں پیچھے سے یہ اطالوی ہیں کہ نیدرلینڈ سے آئے ہیں۔ پتہ نہیں ان کے باپ دادا اس وقت یہاں آئے جب انگریزوں اور آئرش لوگوں میں کشیدگی نے جنم لیا..... یہ بھی تارکین ہیں۔ ایک وقت تھا جب ان کے آباء غیر قانونی طور پر بغیر تحفظ کے یہاں پناہ گزریں ہوئے، لیکن اب ان دونوں کے پاس نیلا پاسپورٹ ہے۔ عجب ہیکہ ایسے سٹیزن کی ہمدردی غیر قانونی طور پر یہاں آبسنے والے تارکین کے ساتھ نہیں ہے۔ بڈھے امریکن کی صحت اچھی ہے، لیکن بڑھیا کو مہ وسال نے ہنڈا دیا ہے۔ اس کے کان شاید زیادہ نہیں سنتے، کیونکہ وہ گلے میں ہیرنگ ایڈ لٹکائے پھرتی ہے۔ ان دونوں کا گھر ہماری گلی سے دس منٹ کے پیدل راستے پر ہے۔ یہ اپنے مکان کا کچھ حصہ بھوتوں سے بچانے کے لئے کرائے پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ کبھی چینی، کبھی میکسیکو، کبھی کیوبا کے اڈاری پاس رکھ کر وہ محفوظ محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ایسے تارکین خوفزدہ پرندوں کی طرح جلدی سوتے اور صبح جلد اٹھ کر کاموں پر نکل جاتے ہیں۔

مسٹر اینڈ مسز ہارٹ عموماً مجھے Gizbo میں بیٹھے ملتے ہیں۔ دونوں اتنی لمبی مدت ساتھ رہنے کے باعث ہم شکل، ہم عمر اور ہم لباس لگتے ہیں۔ لیکن کہیں ان میں بھی ایک دوری ہے۔ وہ اس بات سے خوفزدہ نظر آتے ہیں کہ دونوں میں سے ایک کو اس سرائے عالمگیر سے پہلے اڑ جانا ہے اور ساتھی کو اکیلے اس گزبو میں بیٹھے بیٹھے لے جانے والی ہواؤں کا انتظار کرنا ہے..... مسز ہارٹ سوچتی رہتی ہے کہ اگر میرے بعد ہارٹ اس کی بیٹی کے پاس فلوریڈا چلائے تو شاید اسے قبر میں آرام مل سکے گا۔

لیکن پھر وہ سوچتی ہے، کیا میری ماں میرے پاس آکر کر رہی تھی؟ وہ تو مرتے وقت لاس اینجلز میں تھی..... اور اکیلے ہی مرنے کے مراحل سے سبکدوش ہوگئی تھی۔ اسے خیال آتا ہے کہ کیا تنہائی سفید فام کلچر کا حصہ ہے کہ اس کی ضرورت؟ کیا تنہائی آزادی کی

آرزو سے پیدا ہوتی ہے کہ Privacy کی خواہش نے فیملی یونٹ کو مالٹے کی پھانکوں سمان علیحدہ پیک کر کے ایک پھل کا حصہ بنا دیا ہے۔

میں یہ خیال آرائی کرتا ہوں کہ امریکی جوڑا اپنے متعلق یوں سوچتا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں نے کبھی بھی ان باتوں کے متعلق کچھ نہ سوچا ہو۔

معاف کیجئے ہم نے آپ کو زحمت دی بڑھیا کہتی ہے۔

نہیں آپ ویلکم ہیں میں دروازہ کھولتا ہوں۔

نہیں نہیں ہم اندر نہیں آنا چاہتے، کھڑے کھڑے بات ہو جائے گی۔

فرمایئے؟

بات یہ ہے کہ کچھ Racist اس علاقے میں رہتے ہیں۔ ہم نے ان کے خلاف ایک تحریک چلائی ہے۔ انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مضامین لکھنے پڑتے ہیں۔ پمفلٹ چھاپنے پڑتے ہیں۔ سیمینار کرنے ہوتے ہیں۔ جس کے لئے چندہ جمع کرنا پڑتا ہے۔ کیا آپ کچھ پیسے Countribute کرنا چاہتے ہیں۔ عورتنیمقاصد کی تشریح کی۔

ضرور ضرور..... میں نے ہاتھ آپس میں ملتے ہوئے کہا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ پرانے تارکین میں سے ہیں؟ عجب بات ہے کہ آپ دو ایک نسلیں گزر جانے کے بعد امریکی ہو گئے، لیکن وہ مسلمان جو سپین سے اس وقت آئے جب یہاں Mexican سارے امریکہ کے مالک تھے اور وہ نیگرو جو اس وقت یہاں پہنچے جب یہاں کوئی سڑک، بازار نہ تھے..... وہ ابھی تک بلیک نیگرو ہیں، مسلمان ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہیں اور امریکی نہیں ہو سکے۔

اسی کیخلاف، اسی تعصب کے خلاف ہم جنگ کرتے ہیں۔

آپ پیسے لے لیجئے لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کامیاب نہیں ہوں گے..... آپ ان کو شاید حقوق تو دے پائیں، لیکن آپ انہیں محبت اور انصاف نہیں دے سکیں گے.....

وہ اپنی شکل اور رنگ کا تاوان اندر کے احساس کمتری سے ادا کرتے رہیں گے......یہی آپ کی اور ان کی سانجھی سزا ہے۔آپ احساس جرم سے اور وہ احساس کمتری سے گھٹتے بڑھتے رہیں گے۔

انہوں نے خاموشی سے دس ڈالر کا نوٹ پکڑ لیا اور رسید بنا کر مجھے دے دی۔شاید وہ بھی اندر سے Racist تھے اور اپنا احساس جرم مٹانے کے ل ءِ رخت سفر باندھنے سے پہلے اللہ کو قرض حسنہ دینا چاہتے تھے۔

چالیس پچاس سال پہلے مشرق کا Extended فیملی ایک بہت بڑا Support سسٹم تھا۔اب یہ سسٹم کمزور پڑ رہا ہے۔مشرق میں زندگی خاندان کے تابع چلتی رہی ہے۔اگر خاندان طاقتور، امیر اور عزت والا ہو تو کبھی کبھی یہ مافیا کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔فرد معاشرے کے تابع، خاندان سے وابستہ، روایت کا پابند، اپنی شخصی آزادی کو بھینٹ چڑھا کر عافیت کی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔

سفید فام لوگ اور خاص کر امریکی معاشرہ خاندان کی زنجیریں توڑ چکا۔یہاں فرد نظام کا تابع ہے۔ ہر شہری پابند ہے۔حکومت چاہے ڈیموکریٹ کی ہو چاہے Republican کی، ہر شہری نظام کا پابند رہے گا۔ وہ حکومتی Infrastructure کو توڑ کر اپنی آزادی کا اعلان نہیں کر سکتا۔اسے لال بتی پر آدھی رات کے وقت بھی رکنا پڑتا ہے۔وہ ٹول ٹیکس پر بڑی رضا و رغبت سے رکے گا۔ٹیکس ادا کرنے پر مجبور ہوگا۔ہر شہری اپنی Free Will سے اس پابندی کو قبول کرتا ہے جو امریکی Countitution نے اس کی بہتری کے لئے بنائی۔کسی نظام کو توڑنا اور اپنی آزادانہ روش یا آزاد خیال کے پیش نظر کوئی خصوصی رعایت طلب کرنا امریکی نظام زندگی کے منافی ہے۔یہاں سفارش، کنبہ پروری، اس لئے نہیں ہوتی کہ یہاں خاندان کا تصور ہی ڈھیلا پڑ چکا ہے۔اقربا پروری کہاں سے آئے گی؟

امریکہ میں نبیوں کا بنایا ہوا نظام نہیں چلتا، کیونکہ یہاں بہت سی قومیں، مذاہب

نسلیں مستقلاً ایک دوسرے سے بھڑتی رہتی ہیں۔ جھگڑے اور تصادم سے بچنے کے لئے اور اکثریت کی خواہش کو مدنظر رکھ کر امریکی شہریت مذہب کو ذاتی لاکر میں بند کر کے ہیومن رائٹرز کا کریڈٹ کارڈ استعمال کرتا ہے۔

جونہی امریکی شہری نظام کا پابند ہو جاتا ہے۔ حکومت ماں باپ بن کر عام رعایا کی آزادی سلب کر کے اسے نظاموں میں جکڑ بند کر لیتی ہے۔ پھر حکومت شخصی آزادی پر پہرہ نہیں بٹھاتی۔ جب قانون اکثریت پر لاگو ہو چکتا ہے، قسطوں پر مکان، بیکار لوگوں کو وظیفے ملنے لگتے ہیں اور حکومت ویلفیئر سٹیٹ میں بدل جاتی ہے تو پھر وہ شخصی آزادی کے دروازے کھول دیتی ہے۔ وہ نیک دل امریکی جو سارا دن غلاموں کی طرح نظام کو پوجتے اور حکومتی حکم کو بجالانے کو ایمان سمجھتے ہیں، جو محنت کی اخلاقیات کو انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ شخصی زندگی میں سب زنجیریں توڑ کر من مانی کرنے کو بھی اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور تضاد کا پنڈولم نظاموں کی پابندی کے بعد شخصی آزادی کی طرف رواں ہو جاتا ہے۔ فرد ذاتی عمل میں اس وقت تک پورا آزاد ہے جب تک اس کا عمل کسی دوسرے کی آزادی میں خارج نہ ہو۔ فرد کی آزادی وہیں تک ہے جہاں سے کسی دوسرے شہری کی ناک شروع ہو جاتی ہے جب امریکی شہری کا مفاد حکومت کے نافذ قوانین سے ٹکراتا ہے تو لامحالہ حکومت شہری کے پرخچے کر لیتی ہے۔ آپ شخصی زندگی میں رکھیل رکھیں یا سرے سے شادی نہ کریں اور فلرٹ کر کے ڈنگ ٹپائیں۔ شراب میں مست رزیں یا بال رنگ کر پنک بن جائیں۔ بچے خود پالیں یا کسی اور کے سپرد کر کے کام پر چلے جائیں۔ والدین کی خدمت خود کریں یا انہیں کسی بڈھا ہاؤس میں چھوڑ آئیں، حکومت دخل انداز نہیں ہوگی۔ آپ ہم جنسیت میں مبتلا ہوں اور حرت لوط کی قوم کے نافرمانوں میں سے ہو جائیں، حکومت آپ سے معذرت طلب نہ کرے گی۔ یہ آپ کا ذاتی مسئلہ سمجھا جائے گا۔ کوئی خاندان پوچھ گچھ کے لئے حاضر نہ ہوگا۔ حقہ پانی بند کرنے کا تصور امریکی معاشرے میں موجود نہیں۔ کوئی آپ کی شخصی

زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔لیکن ازلی تضاد یہاں بھی در آئے گا۔

نظاموں کے پابند معاشرے میں ذاتی زندگی آزاد ہوگی اور معاشرہ اسی شخصی آزادی کے باعث مشکلات سے دو چار ہوگا۔طمانیت،سکون شانتی کی کمی ہوگی۔ذہنی نفسیاتی بیماریاں بڑھیں گی۔طلاق کی شرح میں اضافہ ہوگا۔شلٹر ہومز بڑھیں گے۔فرد کا سپورٹ سسٹم نہ ہونے کی وجہ سے تنہائی کا روک عام ہوگا،لیکن اگر آپ شراب پی کر ڈرائیو کریں گے،چالان ضرور ہوگا۔بچے کو ماریں پیٹیں آپ کا بچہ پولیس کو فون کر کے آپ کی شکایت کر دے گا۔آپ پنک بن کروں گا،فساد کریں یا کوئی عورت آپ پر یہ ثابت کر دے کہ آپ اس سے شادی کا وعدہ کر کے وعدہ خلافی کے مرتکب ہوئے تو پھر شخصی آزادی ختم ہو جائے گی۔آپ کو حدود کراس کرنے کی سزا ملے گی۔

مشرق کا حساب اس سے برعکس ہے۔ہمارے معاشرے میں فرد پابند اور شہری آزاد ہے۔یہاں ابھی ہم خاندان سے منفی اور مثبت دونوں طریق سے وابطہ ہیں۔ہمارے رسم ورواج،لین دین،محبت اور نفرت کے سارے سرچشمے خاندان سے نکل کر بہتے ہیں۔خاندان حقہ پانی بند کرتا ہے۔شخصی آزادی پر کڑے پہرے ہیں۔ہم حکومت،قانون،نظام کی پابندی سے آزاد ہیں۔لال بتی کراس کر جائیں پرواہ نہیں، ٹیکس نہ ادا کریں،قانون شکنی پر دل میں ملال نہ لائیں۔قانون کا گلا قدم قدم پر گھونٹیں،کوئی عیب نہیں۔سرکاری زمین پر تجاوزات کر کے جنگلے چڑھا لیں،درخت لگائیں،باغیچے بنائیں۔غیر قانونی مکان تعمیر کر کے کچی آبادی بسا لیں،سب جائز۔ حکومت سر پیٹتی رہے،قانون مکے دکھائے،سب چلتا ہے۔جن گھروں پر احتساب کی ہر لگتی ہے،ان سے میل ملاقات فخریہ جاری رہتا ہے۔یاں پابندی ہے تو صرف فرد کی ذاتی زندگی پر۔مشرقی لوگ شخصی زندگی میں رسم ورواج،کلچر،مذہب کے پابند ہیں۔ ذات پات کی بندش کو فرد قبول کرتا ہے۔والدین ابھی ادب کے درجے پر ہیں۔بچے کی وجہ سے ناکام شادی کو نبھایا جا سکتا ہے۔رشتہ داروں کی رائے آپ کے شخصا

کا تعین کرتی ہے۔ آپ اپنے متعلق جو بھی خیال رکھیں، لیکن رائے آپ کے معلق وہی چلے گی جو آپ کا خاندان طے کرتا ہے۔ آپ بھاری تاوان، قیمت یا مشکلات کا سامنا کئے بغیر خاندان کا پھندا گلے سے اتار نہیں سکتے۔ آپ اچھا شہری بن کر معاشرے میں عزت حاصل نہیں کر سکتے۔ بلکہ اچھا شوہر، بھائی، بیٹا بن کر عزت کا مقام مل جایا کرتا ہے۔ مشرقی معاشرے میں رشوت، سفارش، دولت کی ہوس دراصل خاندان کی آبیاری کے باعث پھلتی پھولتی ہے۔ تعلقات آپ کو ایسے خودغرض کاموں کی طرف مجبور کرتے رہتے ہیں اور نظام چلنے نہیں دیتے۔ جب معاشرے میں محبت، مروت اور یگانگت کے رشتے ہوں تو پھر سپورٹ سسٹم کے باعث نفسیاتی مسائل کم، اسی سپورٹ سسٹم کے باعث تنہائی کم تر اور سکون، طمانیت قلب وافر انداز میں ملتی ہے، لیکن نظام نہیں چلتے اور نظام نہ چلنے کی صورت میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہو پاتی۔

میں آپ سے یہ بات نہیں کر رہا کہ مغرب بہتر ہے یا مشرق کی حالت قابل رشک۔ میں اپنی سوچ میں بس یہاں تک سوچ پایا ہوں کہ ازلی تضاد دونوں جگہ موجود ہے۔ مغرب میں یہ تضاد فرد کی ٹوٹ پھوٹ پر منتج ہوا ہے اور مشرق میں اسی تضاد نے حکومتوں کے استحکام کی نفی کی ہے۔ مغلیہ بادشاہت کے زوال کی داستان بھی دراصل خاندان کے فتح کی کہانی ہے۔ مشرقی ممالک میں جمہوریت کے فیل ہو جانے کا راز بھی خاندان کی مضبوطی میں پنہاں ہے۔

مغرب اور مشرق اسی لئے کبھی مل نہیں سکتے کہ مشرق میں ابھی فلاح کی تلاش جاری ہے۔ فلاں کا سفر فرد سے شروع ہو کر بالآخر معاشرے میں ضم ہوتا ہے۔ ترقی کی منزل معاشرے کی فراوانی، آسائش و زیبائش کے بغیر ممکن نہیں ..... اور تنہائی پر منتج ہوتی ہے۔ دونوں طریقے مختلف ہیں۔ ایک شمال سے جنوب کا سفر ہے، دوسرا مشرق سے مغرب کی جانب بڑھنے کی مسافت ہے۔ کیا جانے نقطہ اتصال کہاں ہے؟ کیا فلاح اور ترقی بیک وقت ممکن بھی ہے اور کس قدر اور کہاں تک اور کیونکر؟

میں ایک جھکی بوڑھے کی طرح یہ تقابلی سوچیں پیش کرتا رہتا ہوں۔ بوڑھا آدمی عموماً ماضی میں پناہ لیتا ہے اور اسی طرح دائرے کے سفر میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ خوفزدہ رہتا ہے۔ جانتا ہے کہ سیدھی لائن کا سفر تو بالکل فنا میں ضم ہوتا ہے۔ ناکارہ تکلیف دہ زندگی کے باوجود بوڑھا فنا کو قبول نہیں کرتا۔

شام پڑ چکی ہے۔

بائی لین پر اکا دکا کار گزر جاتی ہے۔ لوگ کبھی کے گھروں کو لوٹ چکے۔ میں ارجمند کے لئے ہاف اینڈ ہاف کا دودھ اٹھائے گھر جا رہا ہوں۔ یہ پلاسٹک کی بوتل ویسی زمزمی سے مشابہ ہے۔ جس میں عمرے یا حج کے بعد لوگ آب زم زم لایا کرتے ہیں۔ اس نیم اندھیرے میں ابھی مجھے فٹ پاتھ پر کراس کر کے ایک آدمی گزرا تھا۔ اس کے پاؤں یوں پڑ رہے تھے جیسے وہ گھٹنوں چلا ہو۔ اس کی آنکھوں میں کسی مہربان چہرے کی تلاش تھی۔ تنہائی اسے اتنی جگہ سے ڈس چکی تھی کہ اب اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ زیادہ لوگ اپنے اپارٹمنٹس میں پہنچ چکے تھے۔ بتیاں جل چکی تھیں۔ ایک دکان میں دو نیگرو ایک ڈمی مینا کن کو سبز رنگ کا لباس پہنانے میں مشغول تھے۔ دور کہیں کاروں کا شور بھی اس خاموشی کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔

شاید زندگی کے مسائل سلجھانے کے لئے ایک زندگی کافی نہیں۔

ساری ضروریات کا اندازہ لگائیں تو ایک نوکری بھی کافی نہیں۔

ایک محبوبہ بھی اطمینان کا باعث نہیں، کیونکہ وہ بھی تحفے میں آپ کو اپنی بے اطمینانی ہی دے سکتی ہے۔ جس طرح وہ ایک کندھے کو جھکائے من من کا پاؤں اٹھاتا رکھتا گزرا ہے لگتا ہے۔ اس کے پاس کوئی نوکری، عورت، گھر یا شہر نہیں ہے۔ وہ خانہ بدوش ہے، لیکن اس کے پاس خانہ بدوشوں کا کنبہ نہیں۔ ان کے رسم و رواج بھی اس کے نہیں۔ وہ زندہ رہنے کی تقویت کہاں سے لے ..... ایسا فلنگ سٹیشن کہاں تلاش کرے، جہاں وہ اپنی ٹینکی میں کچھ عرصہ اور جینے کے لئے گیس بھروا لے۔ کیا وہ سان

ڈیگو چلا جائے؟ کیا نیویارک بہتر ہوگا۔ کیا کیوبک کے لوگ زیادہ مہرباں ہوں گے ..... وہ باون ریاستوں کے امکانات کے متعلق سوچتا ہے۔ کبھی امید اسے آنکھ مارتی ہے، کبھی خوف اسے ڈسنے لگتا ہے۔

اس کے کانوں میں دادی کی آواز آتی ہے۔ ہمارے زمانے میں ایسے نہیں ہوتا تھا بیٹا۔

باپ کہتا ہے جب میں نوجوان تھا۔

چچا اسے وہ کہانیاں سناتا ہے جن میں سکول کی شرارتیں تھیں۔

ماں اسے باہر جانے سے روکتی ہے۔

لیکن ان سب کو تو وہ پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ وہ حفاظتیں روک ٹوک تو اس نے خود ختم کر دی تھیں۔

وہ تو امریکہ میں ہے جس میں آزادی کا مجسمہ ساحل میں جکڑے سمندر کے تلاطم کو صبح و شام دیکھتا ہے۔

یہ تو ایسا دیس ہے جس کی وادیوں میں ندیاں جنگلوں میں دریا بہتے ہیں۔ سمندر سے جڑے پہاڑ اور میلوں لمبے ریتلے ساحل ہیں۔ یہ بڑے بڑے بزنس مین کا دیس ہے جن کے ایسے بنک اکاؤنٹ ہیں جیسے کسی چھوٹے غیر ترقی یافتہ ملک کا بجٹ ہو۔ یہ پنٹا گون کا ملک ہے۔ ارلنگٹن کے قبرستانمیں یونیفارم سمیت دفن کئے ہوئے لوگوں کا دیس ہے ..... وہ یہ ملک ہے جو آزادی دینے اور چھیننے کا داعی ہے۔

اپنی آزادی ثابت کرنے کے لئے وہ افغانوں کی آزادی سلب کر سکتا ہے۔

اپنی طاقت کا ثبوت پہنچانے کے لئے وہ عراق کو تباہ کر سکتا ہے۔

وہ ترقی پذیر ملکوں کو انگوٹھا دکھا کر، گلہ دبا کر، مکا گھما کر اپنی شرائط پر قرض ٹھونس سکتا ہے اور پھر تباہ کرنے کے بعد تباہی سے بچا بھی سکتا ہے۔

یہ وہ اکیلی سپر پاور ہے جو زبردستی صحت مند معاشروں پر اپنے ایجاد کردہ علاج

ٹھونس سکتی ہے۔

ابھی جو آدمی ایک کندھا گرا کر میرے پاس سے گزرا ہے، اس نے کبھی ایسی باتی نہیں سوچیں۔ وہ تو صرف جینے کا حق چاہتا ہے اور کچھ نہیں۔

ایک گھر ..... ایک نوکری ..... ایک گھر والی ..... ایک بچہ وہ قناعت پسند، تھوڑی عزت پر راضی ایک نارمل وسطی زندگی گزارنے کا آرزومند ہے، لیکن شاید ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ بھی امریکہ میں دولت کمانے زیب و زیبائش کی زندگی گزارنے کے لئے ملک بدر ہوا ہے۔ میں اس سے آگے گزر کر ہانپنے لگتا ہوں۔ اب کبھی کبھی مجھے خواہ مخواہ سانس چڑھ جاتا ہے۔ میں بلال سے اپنی صحت کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میری کنپٹی میں جو جلترنگ بجتا ہے۔ وہ یا تو انحد باجہ ہے یا ہائی بلڈ پریشر کی تمہید ہے۔ بلال سے بیماری کا ذکر اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا دن پہلے ہی ضروری اور غیر ضروری مصروفیات سے اٹا پڑا ہے۔ ارجمند اور بلال نے ہر گھنٹے منٹ سیکنڈ کا پروگرام بنایا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں جینے کے لئے وقت نہیں پروگرام ہی پروگرام ملتے ہیں۔ مشاہدے، تخیل، وجدان کی ان کی زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔

میں شام کے جھٹپٹے میں ایک خالی بنچ پر بیٹھ کر ہاف اینڈ ہاف کا بوتلا پاس رکھتا ہوں، تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ بنچ پر پہلے سے کوئی بیٹھا ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر ایک طرف کھسک جاتا ہے۔ گویا میرے لئے جگہ بنا رہا ہو۔ یہ خوبصورت گورا چٹا نوجوان یا تو یورپی ہے یا امریکن، وہ انگریز اس لئے نہیں لگتا کہ اس کے چہرے پر پرے پرے نہیں لکھا اور میری آمد پر اس نے اپنے چہرے کا دریچہ بند نہیں کیا۔

ہائے۔

وہ بھی ہائے کہہ کر جوابی پیش رفت کرتا ہے۔

اگر آپ چاہیں تو میں کسی دوسری بنچ پر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ امریکن لہجے میں انگریزی بولتا ہے۔

''نہیں نہیں..... میری خوش نصیبی ہے کہ تم جیسا خوبصورت نوجوان ہم بنچ ہے''۔

فاصلے سے ایک کارہم پر روشنی کا تختہ ڈال کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس سرچ لائٹ میں اس کے براؤن بال، نیلی آنکھیں اور سفید رنگ کی جاذبیت مجھے کھینچتی ہے۔ میں ہمیشہ سے کالی قوموں کی طرح جمال پرست ہوں۔

کیا آپ مجھ سے باتیں کرنا چاہیں گے؟ وہ یکدم اردو میں کہتا ہے۔

ضرور ضرور..... بسم اللہ.....

میں اپنا تعارف کرادوں۔ میں پشتون افغانی ہوں اور میرا نام عبدگل ہے۔ میرا باپ اپنا خاندان لے کر..... پشاور میں پناہ گزیں ہوا..... یہ تب کی بات ہے جب ہم امریکہ کی جنگ روس کے خلاف لڑ رہے تھے۔ تب ہمیں ہتھیار بھی ملتے تھے اور روپے پیسے کی مدد بھی حاصل تھی..... میرا باپ امیر آدمی تھا، اس لئے ہمیں پشاور میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ آپ جانتے ہیں امیر آدمی کو کہیں بھی دقت پیش نہیں آتی، وہ امریکہ میں ہو یا پاکستان میں، افغانستان ہو یا وہ زندگی کے وار دولت پر جھیل لیتا ہے۔ پھر میری ماں فوت ہوگئی۔ ماؤں کی بھی عجب مصیبت ہے۔ جب انکی بہت ضرورت ہو تو وہ قصداً فوت ہو جاتی ہے۔

ہم دونوں چند ثانیے خاموش رہے۔

''آپ بور تو نہیں ہو رہے بابا جان.....''

''نہیں یار۔ عبدگل میں سمجھتا ہوں You have made my day میں ایسی ہی سرراہے گاہے ملاقاتوں پر تو زندہ ہوں..... اب تو ٹیلی فون اور خط بھی نہیں آتے کبھی۔

وہ میری بات سمجھ نہ پایا، کیونکہ ابھی وہ عمر کے ایسے حصے نہ تھا۔

''میرے باپ نے شادی کرلی۔ دوسری شادی..... یہ نہیں کہ اسے عورت کی ضرورت تھی، بلکہ وہ امیروں کی طرح کاہل تھا اور گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں پر وہ

درشت ہو جایا کرتا۔ میری نئی ماں بھی افغانی پشتون تھی، لیکن اس کا خاندان تین پشتوں سے لاہور میں مقیم تھا۔ اس میں پنجاب والوں کی طرح آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی۔ اس نے مجھے بھی ترقی کے راستے پر ڈال دیا اور..... میں بڑی چھوٹی عمر میں اے لیول کرنے کے بعد یہاں آ پہنچا۔

عبدگل..... لیکن خیر..... بتاؤ یہاں آ کر تم نے کیا پڑھا؟

انجینئر کی..... نوکری کی، پیسہ کمایا، لنڈھایا، برباد کیا..... زندگی کو انجوائے کیا، کئی لوگوں کو عیش کرائی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا بابا جان کہ میں نے اس سرزمین پر قدم دھرتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس سوسائٹی میں اسی وقت پھل پھول سکتا ہوں، جب میں لبرل رہوں..... آپ جانتے ہیں لبرل کون ہوتا ہے؟

''فراخ دل.....''

''ضروری نہیں.....''

''دوسروں کو قبول کرنے والا.....''

''یہ بھی ضروری نہیں.....''

''پھر میرا خیال ہے دوسروں کے کلچر اور مذہب کو بھی ایک حقیقت ماننے والا..... اختلاف پر پل تعمیر کرنے والا.....''

''ہاں۔۔۔'' دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھی۔۔۔ انسان کتنا مجبور ہے!

''آپ نہیں جانتے بابا جان..... لبرل صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جو کسی بھی کھونٹی سے نہ بندھا ہو..... وہ کسی وطن پرستی کے جذبے سے سرشار نہ ہو..... کسی خاص مذہب، مسلک، رسم و رواج کا پابند نہ ہو..... وہ اس قدر خالی ہو کہ ہر وقت دوسروں کے سانچے میں اگر ڈھل نہ سکے تو کم از کم اپنی ذات میں دوسروں کا مذہب، کلچرل، رسم و رواج بھر سکے۔ نہ اس کا ضمیر اس تبدیلی پر اسے لعنت کر سکے، نہ ہی وہ کسی احساس جرم میں مبتلا ہو۔

کچھ لوگ بڑی آسانی سے نئی عورتوں کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتے ہیں بابا جان کیونکہ ان کے اندر کسی عورت کا نہ بت ہوتا ہے نہ تصویر..... وہ وفا کے جذبے سے آشنا نہیں ہوتے، اس لئے بدلتے رہنے میں انہیں مشکل پیش نہیں آتی..... میں نے بھی یہاں گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدلے، کئی موڑ کاٹتے..... پھر میرے والد واپس قندھار چلے گئے۔ پوپی سیڈ سے کمائی ہوئی ساری دولت انہوں نے میری دوسری ماں کے نام کر دی اور اپنی دونوں بیٹیاں ساتھ لے کر اپنے آبائی وطن چلے گئے..... میں دو ایک بار قندھار گیا، لیکن میں لبرل آدمی تھا۔ میرا قندھار میں دل نہ لگ سکا۔ وہاں طالبان کی حکومت تھی، جو احکامات خداوندی کے پابند تھے۔ سب سے بڑی تکلیف مجھے وہاں داڑھیاں دیکھ کر ہوتی تھی، پھر عورتوں کے برقعے مجھے وحشت میں مبتلا کر دیتے۔ میری دونوں بہنیں پشاور میں برقعہ نہیں پہنتی تھیں، لیکن قندھار میں انہوں نے بھی شٹل کاک برقعہ اختیار کر لیا تھا۔ میں لبرل تھا، ہر قسم کے کلچر اور مذہب سے سمجھوتہ کرنے میں پہل کیا کرتا۔ ہر قسم کے کھانے، لباس، رسم و رواج قبول کرنے میں مجھے دیر نہ لگتی، لیکن برقعہ اور داڑھی دیکھ کر نہ جانے کیوں میں غصے میں آجاتا۔ لبرل ہونے کے ناطے مجھے یہ کلچر بھی قبول کرنا چاہئے تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں میرے اندر چڑ پیدا ہوگئی۔ آخری شام جب میں اپنے دادا سے رخصت ہونے مردانہ بیٹھک میں پہنچا تو میں سگریٹ پی

رہا تھا۔ میں چونکہ لبرل بھی تھا اور سچا بھی تھا، اس لئے میں نے سگریٹ بجھانے کی کوشش نہ کی۔ دادا نے مجھے منع نہ کیا۔ حسن اتفاق سے اس وقت ڈیرے پر کوئی نہ تھا اور دادا بڑے سے گاؤ تکیے سے کمر لگا کر تسبیح پھیرنے میں مشغول تھا۔ مجھے یوں بے باکی سے گریٹ پیتا دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری بیدار ہوئی، لیکن دادا نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

میں واپس جا رہا ہوں دادا جان۔

کب؟

آج شام کی فلائٹ سے اسلام آباد ..... پھر وہاں سے ماں کو سلام کر کے امریکہ.....

میرے دادا نے ماں کے نام پر ہلکی سی تیوری چڑھائی۔ گاؤ تکیئے پر اس کا وزن بڑھ گیا۔

تمہاری دوسری ماں نے ہماری سرزمین کو قبول نہیں کیا، حالانکہ وہ بھی پشتون خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے ہماری زبان، کلچر کو اپنانے کی کوشش نہیں کی..... پتہ نہیں کیوں؟

میں دادا کو بتا نہ سکا کہ وہ پتوں کے بغیر ننگی بوچھی ڈالی کو قبول نہیں کر سکتی..... طالبان کی حکومت میں کوئی ایسی دلکشی نہیں دادا..... جو ماں کو یہاں آنے پر آمادہ کرے۔ عورت اور بچہ، دادا، کھیل تماشے، لہو ولعب، عیش وعشرت کے بغیر سوکھنے لگتے ہیں، پتہ کے بغیر شاخ کس کام کی؟ اسے بنایا ہی اس لئے گیا تھا کہ بابا آدم کا دل لگائے..... وہ خوشی کے اصول پر پیدا کی گئی۔ اسے طالبان کی حکومت راس نہیں آسکتی۔ جہاں ہر وقت ضبط نفس کا کوڑا چلے۔

میں بھی دوسری ماں کی طرح برقعے والی عورتیں..... داڑھی والے مرد چھوڑ کر یہاں آ گیا۔

ایک لمبے ٹرک نے ہم دونوں پر اپنی سرچ لائٹ پھینکی اور پھر آگے بڑھ گیا۔ میں نے عبدگل کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا۔ ایک مرتبہ اخبار میں اس کے ہم شکل آدمی کی تصویر چھپی تھی، وہ بوسنیا کا مجاہد تھا۔ اس کے ماتھے پر لمبے زخم کا نشان تھا اور اس پر جھکی ہوئی عورت نے سکارف سے اپنے بال ڈھانپے ہوئے تھے۔ اصغری جو گم سم سائے کی طرح سلیپر کھسکاتی کمروں میں بند چڑیا کی طرح گھومتی رہتی۔ اخبار اٹھا کر اس تصویر کو دیکھنے کے بعد بولی تھی..... کتنے خوبصورت لوگ ہیں بوسنیا کے..... لوگ ان غریبوں کے کیسے بیری ہو گئے..... ہائے ہائے بڑا ظلم ہے بڑا ظلم ہے.....

عبدگل کو دیکھ کر میرے دل میں بھی خواہ مخواہ کا غم موجزن ہو گیا۔ شاید انسان بنیادی طور پر جمال پرست ہے۔ وہ کسی کالے بھینگے بچے پر اس طرح نہیں پسیجتا، جیسے وہ ایک نیلی آنکھوں والے گورے گول مٹول بچے کو دیکھ کر پوری طرح خوش آمدید بن جاتا ہے۔

اگر تم واپس جانا چاہو تو کہاں جاؤ گے افغانستان کہ پاکستان؟.....

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

میں گیارہ ستمبر سے پہلے بہت لبرل تھا بابا جان..... کیونکہ میں کسی خیال، مسلک، مذہب، ملک، خاندان سے وابستہ نہیں تھا۔ نہ میری جڑیں کہیں تھیں، نہ میرا دماغ کہیں تھا..... جو آدمی کم ہیں بندھا ہو، وہ آسانی سے لبرل نہیں ہو سکتا..... میں سوچتا رہتا کہ کمیونزم نے فیل ہو کر فرد کے لئے بڑی مشکل پیدا کر دی ہے۔ اب جمہوریت اور سرمایہ پرستی کے علاوہ اور کوئی مذہب قابل تقلید نہیں رہا۔

اتنا نہ سوچا کرو برخوردار..... جوانی عمل کا پریڈ ہے..... توہمات کے پیچھے بھاگنا اور سوچ کا بیوپار میری عمر کا مشغلہ ہے..... کھاؤ پیو اور بلے لوٹو۔

وہ میری بات نہیں سن رہا تھا۔ وہ کہیں اور تھا، کھویا ہوا اور پریشان۔

گیارہ ستمبر کے بعد پتہ نہیں کیوں میں نے نوکری چھوڑ دی..... اور تاریخ پڑھنا

شروع کر دی..... میں بش کے ایکشن کا جواز ڈھونڈنا چاہتا تھا..... میں نے ظلم کی تاریخ کو بہت مقامات پر سٹڈی کیا بابا جان..... کشمیر..... بوسنیا، چیچنیا، جلیانوالہ باغ، ہلاکو، نادر شاہ، چنگیز خان..... کھال کھنچوانے کے واقعات، پنجروں میں بند قیدی..... ہٹلر، ہیروشیما..... اتنے سارے مظالم جو انسان پر ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے مجھے اور لبرل کر دیا ہے..... میں اب اتنا لبرل ہو گیا ہوں بابا جان..... کہ اب میں اللہ سے بھی آزاد ہو گیا ہوں۔ میں اس اللہ کے تصور کو نہیں مانتا جو حدود تو مقرر کرتا ہے، تقدیر تو لکھتا ہے..... لیکن پکارنے پر مدد کو نہیں آتا..... اب میں اتنا لبرل ہوں کہ میں ہر انسان کے عمل کو اس کی ذاتی ذمہ داری تصور کرتا ہوں..... اس طرح وہ ایسے ضبط نفس کو اپنے پر عائد کرتا ہے، جو کوڈ وہ خود بناتا ہے، وہ ایسی حدود رکھتا ہے جو اس کی خود ساختہ ہیں۔

یعنی تم آواگون میں یقین رکھتے ہوں..... جو عمل تم کرو گے اس کا دوسرے جنم میں عذاب یا ثواب بھگتو گے؟

وہ چند لمحوں کے لئے مسکرایا اور پھر بولا..... میں لبرل آدمی ہوں۔ میں چکروں کا قائل نہیں۔ جب ایک ہی چکر میں اس قدر غم و غصہ بھگت لیا تو دوبارہ یہاں آنے کا فائدہ؟

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کہاں پھاہا رکھوں..... زخم کا دہانہ دکھتا، لیکن نظر آتا تھا۔ اس کی ٹیس کہیں نیچے تھی۔ میں اسے تسلی دینا چاہتا تھا۔

عبدگل

جی سر

کیا تم سارتر کی طرح فرد کے لئے مکمل آزادی چاہتے ہو..... عمل کی مکمل آزادی؟ عمل کی پوری ذمہ داری۔

نہیں بابا جان..... انسان دور خا ہے..... وہ ہر جگہ ہر لمحہ دوئی کا شکار ہے کوئی شخص

پابند ہوئے بغیر آزاد نہیں رہ سکتا..... زندگی دن اور رات کا اکٹھا سفر ہے حق و باطل کی جنگ سدا بہار ہے۔ میں چاہوں نہ چاہوں، لیکن اتنا ضرور مان گیا ہوں، یہ زندگی پنڈولم کا سفر ہے..... انسان زندگی اور موت کی دوئی کے درمیان..... اگر کہیں وسط میں پنڈولم کو روک سکے..... اگر جنگ اور امن کے درمیان کہیں رہ سکے تو وہ لبرل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ بندھا ہوا بھی ہو اور آزاد بھی رہے تو وہ خوشی محسوس کر سکتا ہے..... میں قندھار جا رہا ہوں بابا جان..... اس قندھار میں رہوں گا جہاں ڈیزی کٹر اور کلسٹر بموں نے میرا بوڑھا دادا..... میری برقعے والی بہنیں اور داڑھی والے باپ کو ختم کر دیا ..... جب تک میں کسی مذہب، کسی وطن، کسی خاندان کا درد سینے میں نہ بسا سکا، میں یہ نہیں جان سکوں گا کہ دوسرے لوگ بھی میری طرح اپنے وطن، اپنے کلچر، اپنے خاندان سے محبت کرتے ہیں..... جب تک میں اپنوں سے محبت نہ کر سکا تو میں کیسے سمجھ پاؤں گا کہ دوسرے لوگ بھی اسی طرح محبت کے ہاتھوں مجبور ہیں..... میں لبرل ہونا چاہتا ہوں..... انسان دوست اور..... بابا جان کسی مسلک کا پابند ہوئے بغیر انسان آزاد کیونکر ہو سکتا ہے؟ بیچارہ دوئی کا مارا جب تک پابندی کو ساتھ لے کر نہ چلے آزاد کیونکر ہو؟ میں قندھار جا رہا ہوں، جہاں اب میرا کوئی نہیں۔ صرف ملبہ ہے میرے آبائی گھر کا۔

''تم بہت سیانے ہو عبدل گل..... لیکن ایک بات مجھ بڈھے کی بھی یاد رکھنا..... تم ابھی عمل تک پہنچے ہو..... ایک چیز بے عملی بھی ہوتی ہے۔ جب تک عمل کے ساتھ بے عملی کو نہ سمجھو گے دور تک نہ جا سکو گے۔ تم بیک وقت حدود اور آزادی کو ٹٹول رہے ہو، ان دونوں کی Interpretation اگر مذہب سے کشید کی تو فلاح پاؤ گے اور اگر ان دونوں کی سمجھ بوجھ ہیومن رائٹر سے اخذ کی تو آگے پھر دوئی کا سفر ہے، تضاد کا جال ہے۔ ہیومن رائٹر پنڈولم کا سفر تیز کر دیتے ہیں۔ اسے وسط میں لانے کا کرشمہ نہیں کر سکتے۔''